بادل چاند ہوا اور مَیں
سعد اللہ شاہ

فہرست

نظمیں :

سعداللہ شاہ کے شعری مجموعے

بادل چاند ہوا اور میں

بڑھا دیتی ہیں عمروں کو نہ جانے یہ کتابیں کیوں
میں چھوٹا تھا مگر سر پر کئی صدیوں کا سایا تھا

اگرچہ سعد رستے میں بڑے دلکش جزیرے تھے
مجھے ہر حال میں لیکن سمندر پار جانا تھا

سبز رُتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اُٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل، چاند، ہوا اور میں

تمہی ملتے تو اچھا تھا

جہاں پھولوں کو کھِلنا تھا وہیں کھِلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا

تم نے کیسا یہ رابطہ رکھا
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا

تُو نہ رسوا ہو اسلیے ہم نے
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا

اداس موسم کے رتجگے

بحرِ رجز میں ہوں نہ میں بحرِ رمل میں ہوں
میں تو کسی کی یاد کے مشکل عمل میں ہوں

اُس نے پوچھا جناب کیسے ہو
اِس خوشی کا حساب کیسے ہو

وقت روکے تو میرے ہاتھوں پر
اپنے بجھتے چراغ لا رکھنا

ہمیں اقرار کرنا تھا

جو بھٹکتا ہے وہی راہ بنا جاتا ہے
ورنہ بستی میں کہاں سیدھا چلا جاتا ہے

اتنا لکھوں گا ترے بعد ترے بارے میں
آنے والوں نے تجھے پہلے ہی دیکھا ہو گا

وہ بھی بگڑا ہوئی رسوائی بھی
جان لیوا ہے شناسائی بھی

اک کمی سی رہ گئی

اِس میں کیا ہے کیا نہیں مجھ کو اس سے کیا غرض
وہ مجھے اچھا لگا میں نے سوچا کچھ نہیں

وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقین آیا
کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

دِل بھی کیسی شے ہے دیکھو پھر خالی کا خالی
گرچہ اس میں ڈالے میں نے آنکھیں بھر بھر خواب

تشنگی باقی رہے گی

اُس کو خوشبو کی طرح ساتھ بھی رکھوں اپنے
اور پھر اُس کو زمانے سے چھپانا چاہوں

جب تلک اِک تشنگی باقی رہے گی
تیرے اندر دلکشی باقی رہے گی

مجھے کچھ اور کہنا تھا

مجھ سا کوئی جہان میں نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو

لوگ فہم و آگہی میں دُور تک جاتے مگر
اے جمالِ یار تُو نے راستے میں دھر لیا

محرومیوں کا اور بھی احساس یوں ہوا
چاہا تھا جو بھی تیرے سوا مجھ کو مل گیا

ادھوری رات کا غم

اپنی اپنی انا کو بھلایا جا سکتا تھا
شاید سارا شہر بچایا جا سکتا تھا

دیکھو کرشمہ سازیاں تخلیقِ شعر کی
اُلٹے رے جھیل کھیں گے کیسے کنول میں ہم

اُسے کہو کہ ہم اُس کے بغیر جی لیں گے
یہ غم اگرچہ زیادہ ہے آدمی کے لیے

دیباچہ

سعداللہ شاہ کو میں اُن کے طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ اُن دنوں وہ پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (انگریزی) کے طالب علم تھے۔ اُن سے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ ذوق لیکن ذکی الحس بھی ہیں۔ جلد ہی مجھے یہ بھی اندازہ ہُوا کہ وہ بے باک بلکہ ایک حد تک تُند خو ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی رُو رعایت ملحوظ رکھنے کے قائل نہیں۔ اُن میں بے پناہ توانائی موجود ہے۔ ان صلاحیتوں کی بنا پر مجھے توقع پیدا ہُوئی کہ وہ چند برسوں میں معروف شخصیّت بن جائیں گے اور اب جبکہ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ انگریزی ادب کے اُستاد مقرر ہو چکے ہیں اور اُن کے چار شعری مجموعے بھی چھپ چکے ہیں جن میں سے ایک انگریزی میں اور تین پنجابی میں ہیں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے لوگوں کی توقع سے قبل ہی

ادبی حلقوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے، اُن کا پانچواں مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو اردو میں ہے۔ اِس طرح انھیں ایک سہ زبان شاعر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ بات بجائے خود بہت اہم ہے کیونکہ اس وقت ہمارے ہاں دو زبان شاعر تو خال خال مل جاتے ہیں مگر سہ زبان شاعر نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اُردو کے تخلیقی اور تنقیدی ادب میں انگریزی زبان کے اساتذہ نے بڑے قیمتی اضافے کیے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جن میں مرزا احمد سعید، پطرس بخاری، ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر، فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، حمید احمد خاں، ڈاکٹر محمد صادق، محمد صفدر میر، فیض احمد فیض کے اسمائے گرامی فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ انگریزی زبان کے ان اساتذہ نے اُردو ادب کی اتنی خدمت اس وجہ سے انجام دی ہے کہ انگریزی ادب کا مطالعہ طلبا کو غور و خوض کی طرف مائل کرتا ہے اور بہت کچھ مطالعے کے بعد وہ ادب کے مختلف معاملات و مسائل پر ذاتی نقطۂ نظر قائم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ شعر و ادب کی دُنیا میں ذاتی نقطۂ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور تخلیقی ادب میں خاص طور پر انفرادیت کو جنم دیتا ہے۔ سعداللہ شاہ ابھی نوخاستہ نوجوان ہیں مگر ان کا جو شعری سرمایہ ہمارے سامنے آ چکا ہے وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کے کلام میں انفرادیت اور تازگی موجود ہے۔ ان کا اردو مجموعۂ کلام دورِ حاضر کے چند شعری مجموعوں کی طرح مختصر مگر منفرد ہے۔ اگرچہ وہ نظم اور غزل دونوں میں عمدہ شعر کہنے پر قادر ہیں مگر مجھے ان کی نظمیں زیادہ اچھی معلوم ہوئی ہیں۔ سعداللہ شاہ نظم اور غزل دونوں میں اپنے تیشے سے اپنا راستہ بنانے کے قائل ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ اقبال کے لفظوں میں دریائے کاویری کی طرح اپنی مژہ سے اپنا راستہ بناتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں تو یہ بات بالکل بجا ہو گی۔

وہ بنیادی طور پر محسوسات کے شاعر ہیں۔ خواہ مخواہ فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ روزمرہ زندگی کے عام احساسات جو ہر دل پر گزر جاتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد فراموش کر دیے جاتے ہیں، اُن کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ سعداللہ شاہ اُن محسوسات کو بھلانے کی بجائے اُنھیں حرزِ جاں بناتے ہیں اور اُنھیں لفظوں کا موزوں پیکر عطا کر کے حیاتِ جاوداں عطا کرتے ہیں۔ دُوسرے شعرا جن موضوعات کو شعریت سے مبرّا سمجھتے ہیں سعداللہ شاہ اُن سے شاعری تخلیق کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک سچّا شاعر اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ دُنیا کی کوئی چیز بھی شاعری سے تہی نہیں ہے اور اگر دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا ذہن موجود ہو تو ہر چیز کو منفرد زاویۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے اور اُسے شاعری بنایا جا سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں یہ خصوصیت مجید امجد اور مُنیر نیازی میں خاص طور پر موجود ہے۔ مُنیر نیازی نے اس قسم کی محسوساتی نظموں کو نوجوانوں میں بے حد مقبول بنا دیا ہے۔ مگر اس قسم کی شاعری میں اتنے بے پناہ امکانات موجود ہیں کہ جو بھی اُفق تا اُفق پھیلی ہُوئی دُنیا پر غور کرتا ہے وہی اس سے منفرد مضامین اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے میں سعداللہ شاہ کی جن نظموں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا اُن کے عنوانات یہ ہیں، "کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا" "پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے"، "چھوٹے چھوٹے واقعات" — "گڈو" — "ساری باتیں یاد تھیں اُس کو" "سب کچھ سچّا کیوں لگتا ہے" ان نظموں کے چند اقتباسات قندِ مکرّر کے طور پہ ملاحظہ فرمائیں۔

نہ مَیں پاس اُس کو بلا سکا
نہ مَیں دل کی بات سنا سکا
وہ یوں جلد بازی میں چل دیا
کہ مَیں ہاتھ تک نہ ہلا سکا

وہ جُدا بھی کیسے ہُوا کریں
کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا
(کوئی رسم بھی نہ نبھا سکا)

جس میں نہ کوئی ہنس سکتا ہے
جس میں نہ کوئی رو سکتا ہے
ایسے بے بس لمحے پر تو
وقت بھی ساکت ہو سکتا ہے
پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے
(پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے)

ساری باتیں یاد تھیں اُس کو
لیکن ہر اک بات سے پہلے
میرا نام بھُلایا اُس نے
کیسے آج جلایا اُس نے
(ساری باتیں یاد تھیں اُس کو)

صرف کہانی ہی تھی اگر یہ
مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے

سب کچھ سچّا کیوں لگتا ہے
گھر میں ڈر سا کیوں لگتا ہے
کبھی کبھی پھر یوں لگتا ہے
جیسے مَیں بھی بوجھل ہو کر
خود اک پتھّر ہو جاؤں گا
مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے
(سب کچھ سچّا کیوں لگتا ہے)

اِن نظموں کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ ایک منفرد نظم نگار ہیں۔ ممکن ہے بعض قاری ان نظموں میں منیر نیازی کی ہلکی سی پرچھائیں محسوس کریں تاہم اس بات سے ہر شخص اتفاق کرے گا کہ یہ کسی شاعر کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں۔

سعد اللہ شاہ کی غزلوں کے متعدد استعارے بھی اُن کی نظموں کی سی تازگی لیے ہُوئے ہیں۔ اُنھوں نے بیشتر غزلوں کی زمینیں بھی خود تراشی ہیں۔ بنے بنائے راستوں پر چلنے کی بجائے نئے قافیے خوبصورت اور روشن امیجز اُن کے اشعار میں جگ مگ کرتے ہُوئے نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ غزلوں میں بحروں کے تجربات بھی ہیں۔ بحروں میں ارکان کی کمی بیشی کر کے نئی بحریں پیدا کرنے سے انھیں شغف ہے مگر اُن کے ہاں مجموعی تاثر جدّت کا ہے، روایت کی تکرار کا نہیں۔ چند مثالیں بے موقع نہیں ہوں گی۔

یہ سوچ بھی کیسا دائرہ ہے
جو اپنے ہی رستے کاٹتا ہے

مَیں نے انساں سے رابطہ رکھّا
مَیں نے سیکھا نہیں نصابوں سے
کتنا آسان تھا سوال کبھی
جان جاتی ہے اب جوابوں سے
مَیں بھی اپنی انا میں مست رہا
وہ بھی نکلا نہیں حجابوں سے

رات پڑے تو ساری شکلیں آنکھ میں چُھپنے لگتی ہیں
ڈھلتے ڈھلتے دن بھی آخر ہو جاتا ہے رات میں گُم

بڑھا دیتی ہیں عمروں کو نہ جانے یہ کتابیں کیوں
مَیں چھوٹا تھا مگر سر پر کئی صدیوں کا سایہ تھا
مَیں گہری نیند سویا تھا مجھے بادل اٹھا لائے
مَیں اک ندّی کنارے پر کسی وادی کا سپنا تھا
اگرچہ سعد رستے میں بڑے دلکش جزیرے تھے
مجھے ہر حال میں لیکن سمندر پار جانا تھا

سبز رُتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اُٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل چاند ہَوا اور مَیں

سوتے رہنا دیر تک
روتے رہنا دیر تک
ایک فصلِ بے ثمر،
بوتے رہنا دیر تک

حل نکالا ہے یہ اُداسی کا
اب مکمّل اُداس رہتا ہُوں
اُس سے مل کر بھی کچھ نہیں کہتا
مَیں بھی کیا بدحواس رہتا ہُوں

کتنا نازک ہے وہ پری پیکر
جس کا جگنو سے ہاتھ جل جائے

اُس کی ذات حوالوں تک تھی
گزرے بیتے سالوں تک تھی
اُس کے پاس جواب نہیں تھا
ساری بات سوالوں تک تھی

غرض سعد اللہ شاہ شاعری کے میدان میں تازہ وارد ضرور ہیں مگر ناپختہ نہیں ہیں۔ وہ چونکا دینے والے شاعر ہیں۔ اُن کے اس مجموعۂ کلام کے مطالعے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کا مستقبل اُن کے حال سے بھی زیادہ تابناک ہو گا۔ یہ بات اس لیے بڑی اہم ہے کہ ہمارے عہد کے بیشتر شعراء کا حال اُن کے مستقبل سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
اورنٹیل کالج
یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور

صدائے بازگشت بادِ کشتِ خیال

کیمپس کے دھنک رنگ آنچل پر جھلمل کرتا ہُوا موسمِ خواب۔ سبز روشوں پر شام کے دھندلکے کا خمار، سرو اور گلاب کی آغوش میں تتلیوں کا ہجوم، ردائے شب پر جگنوؤں کی نمائش، قطرہ قطرہ اوس میں سمٹا وسیع منظر، شجر شجر پھیلا ہوا رنگِ طلسمِ خوشبوئے بہار، پانی کے تحرّک پر رکھا گیا عکسِ جمال، لطفِ لمحاتِ احساس سے لدی ہُوئی خیال کشتیاں، اور یونیورسٹی کے اِردگرد پھیلی جنتِ ارضی کا خیال، لمحۂ موجود کو آسودگی بخشتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب سب سے طویل دورانیہ موسمِ ہجر و وصال کا تھا۔ جب خرامِ وقت کا نوحہ نہ پانی پر نقش ہوا تھا، نہ ہُوا پر لکھا گیا تھا جب سچ اور جُھوٹ معصُوم جذبے تھے، جب کاروبارِ نفرت و محبّت سود و زیاں سے پاک تھا، اور جب اپنے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میرا شعری مجموعہ "بادل چاند ہوا اور مَیں" اُنہی ایّامِ حسن و جمال کی بازگشت ہے۔

یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب صحرا میں پھول کھلتے ہیں، جنگل میں شہنائیاں
بجتی ہیں، تنہائیاں مہکتی ہیں اور آنکھوں میں کہکشائیں چمکتی ہیں، مگر نشۂ رنگ و بو
اترتے ہی لمحاتِ برزخ شروع ہو جاتے ہیں، کیا کھویا کیا پایا والا احساس، احساسِ زیاں
کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُمنگ حسرت بن چکی ہوتی ہے اُمید محرومی میں بدل
جاتی ہے اور آس، یاس کا رُوپ دھار لیتی ہے۔

آسماں سے زمین کی سمت سفر مزاج اور نفسیات پر گہرے اثرات مرتب
کرتا ہے۔ زمینی رابطے اور رشتے ناپائیدار اور کچے ہوتے ہیں جن کو بچانے کے
چکّر میں پکّے آسمانی ناتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کاوشِ حصولِ رزق میں آئیڈیل کا
بُت چکنا چور ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی آزاد اور سحر انگیز فضا سے نکلو تو تفکّرات
کی دُھند جادۂ فردا کو غیر واضح بنا دیتی ہے یہیں سے راستے بدل جاتے
ہیں، دوست بچھڑ جاتے ہیں۔ سب کا حال ٹوٹے ہوئے "زنجن" کا سا ہو جاتا ہے
کہ سکھیاں عمر بھر دوبارہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ چاہتیں، محبتیں اور وعدے دھرے
کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اِک نیا دور شروع ہو جاتا ہے جہاں ہر خواہش کو
پذیرائی ملتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ چاہت کے سوا سب کچھ مل جاتا ہے۔ پھر
"تمہی ملتے تو اچھا تھا" کی صورت ایک جذبہ ہمیشہ کے لیے دامن گیر ہو
جاتا ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ اور بھی کٹھن ہے۔ یہ "اُداس موسم کے رتجگوں"
میں تارے گننے کا شغلِ رائگاں ہے اور پھر ایک اور احساس کہ "ہمیں اقرار کرنا تھا"

یہ بھی سچ ہے کہ جذبہ زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہوتا ہے
مگر اپنی اصل کا قیدی بھی۔ غالباً یہ بلبلِ بے تاب کو سبزۂ گل کے تلے
رکھنے کا عمل ہے جس میں سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔
ہم مجبورِ محض ہیں۔ ہم کیا اور ہمارا حال کیا! فردا و دی کے درمیان سفر کرتے
کرتے عمر بیت جاتی ہے اور ماتمِ یک شہرِ آرزو کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔
پھر سب کچھ بے جواز ہونے ہوتے بھی ہستی کا جواز ٹھہرتا ہے۔

اُداس موسموں کا حل مکمل اُداسی ٹھہرتا ہے اور دوسرا اقرار نہ کرنے
کی خلش۔ بڑی تکلیف، چھوٹی تکلیف کا علاج ہی تو ہوتی ہے۔ ویسے اداس رہنا
بھی تو ایک طرح کا لطف ہے کہ اس میں سے اک کمی سی دریافت ہوتی ہے۔
یہی وہ کمی ہے جس سے صحرائے درونِ ذات کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ یہ کمی یکجائیت
کے ٹوٹنے کا نام بھی ہے، بہت تاریک شب میں ہتھیلی پر رکھا ہوا چراغ بھی ہے
شدید حبس میں ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھی — اور پتھریلی چٹان سے نکلا ہوا
میٹھے پانی کا چشمہ بھی مگر اس کمی کا عرفان کم کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

ایک وقت آتا ہے جب ہر تجربہ مفروضے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔
کسی سالٹ کا تجزیہ کرنے کے لیے بعض اوقات عملِ معکوس کی ضرورت بھی پیش
آ سکتی ہے۔ اسی بنیاد پر حال سے ماضی کو پلٹنے کا امکان بہر طور سامنے رہتا
ہے۔ یہ ساری تگ و دو غفلت کے سبب سے ہے۔ مگر انکشاف کی صورت میں
فردا کی دھند سے اُمیدِ سحر پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ خواب آنکھوں کے بحرِ سکوت
پر تعبیروں کے نقشِ آئندہ جمانے کی سعیٔ لاحاصل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مگر
پانی کی تشنگی سرابوں سے نہیں بجھتی۔ یہ تو صحرا بھی نہیں بجھا سکتا۔ تشنگی باقی رہے
تو دُنیا کا حسن برقرار رہ سکتا ہے۔ (وہ کمی جو ذات کے ہونے کی گواہی تھی، کم
ہوتے ہوتے تشنگی بن جاتی ہے)

جذبوں کی بلوغت سے قبل طائرِ شام کو حنوط کرنے کی سعیٔ لاحاصل یعنی

متوقع عمل ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب خون کی شکستہ اکائی رگ و پے میں
سرایت کر جاتی ہے تو حرارت اندر طوفان اٹھا دیتی ہے۔ اس جوان سمے میں بے کنار
بحرِ اُمید قدم قدم موجزن رہتا ہے بادِ امنگ کشتیٔ جاں کے بادبان کھول دیتی ہے۔
یہ گلشن ہیں بہار کا زمانہ ہے کہ جب اتنے پھول کھلتے ہیں کہ آشیانے
کی جگہ بھی نہیں بچتی، سانسیں پل پل خوشبوؤں سے لدی آتی ہیں۔ اس
Overwhelmed خوشی کا احساس جیسے پل جھپکتے ہی ختم ہو جاتا ہے غالباً اسی دلاسے
کے بارے میں ہی کسی نے کہا ہوگا۔

Life is a long sentence of sorrow
which is punctuated by happiness.

بے انتہا خوشی کے لمحے ہی تو ساعتِ آئندہ میں ملال رُت لاتے ہیں، برقِ خرمن گرِ
خونِ دہقاں سے ہی جنم لیتی ہے۔ اس خوشی سے اجتناب کرنے والا Promised
Ecstasy میں چلا جاتا ہے مگر جملۂ معترضہ طبیعت کے ادھر آنے کا ہے۔ لمحے
کے آغاز میں غبار ہے اور اختتام پر خلا۔ لمحے کے عین بیچ کشمکش ہے جہاں دو قوتوں
کے سنگم پر سچ ہے مگر غیب کی نصرت لازم ہے۔
شہرِ شعورِ ذات میں خوابوں کے اجنبی قافلے اس کی بھول بھلیوں میں
شبِ تار گزارتے ہیں اور تا بہ سحر تعبیروں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُمنگ اور
ولولے کا دورِ حیاتِ فانی کا لافانی دور ہے جہاں سمندر سے بھی تشنگی نہیں بجھتی،
شبِ ماہتاب آنکھوں میں چمکتی ہے۔ انگ انگ سے مستی چھلکتی ہے روش روش
آئینۂ چشمِ شبنم میں حسن جلوہ آرا دکھائی دیتا ہے۔ شجر شجر پرندے اور پرندہ پرندہ
نغمے ہر جانب طلسم ہوشربا کا سا ماحول تخلیق کرتے ہیں۔ اسی تخلیق کو مزاج پر طاری
کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یہ خود کار عمل ہے۔ یہ لمحات آتے سب پر ہیں، نصیب کسی
کسی کو ہوتے ہیں یہی لمحہ Keats کی شہرۂ آفاق تخلیق Ode to the

Nightingale کے پیچھے کارفرما ہے۔ ایسی محسوسات اپنے آپ کو انکار پر لا کر
کی جاتی ہیں۔ ذات کی مکمل نفی فطرت کا اثبات بنتی ہے یہ Negative
Capiblity، حقیقت میں انتہائی انہاک کی صورت ہے جہاں self
negation (خود فراموشی) خود بخود عمل میں آجاتی ہے۔
انسان اسی منفی رویّے پر آ کر مثبت بنتا ہے اور غور کیا جائے تو
سب کا اثبات اسی طرزِ احساس کے اندر مضمر ہے۔ وہ تو جوہرِ آئینہ ہے جو ہر
منظر واپس کر دیتا ہے اور پسِ آئینہ محوِ تجلیٔ ذات رہتا ہے کہ کوئی عکس اسے
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مل جائے۔ اپنی ذات سے شناسائی ہی تو اصل پہچان ہے
تبھی تو پھول کی مہکار، پرندے کی چہکار، پائل کی جھنکار اور تلوار کی یلغار اپنے ہی
دم خم پر ہوتی ہے اور یہ سب معروض کا داخلی ردِ عمل ہے۔
افسانہ بذاتِ خود کچھ نہیں ہوتا، حقیقت اسے گنجِ معانی عطا کرتی ہے مگر
ہم ہیں کہ حقیقت کو فسانے کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں حالانکہ روشنی حقیقت
سے مستعار ہے۔ یہیں سے پہلی غلطی نے جنم لیا تھا اور کوئی بھی غلطی صرف ایک
دفعہ نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانے میں تھوڑی سی صورت بدل کر اپنے آپ کو دہراتی
رہتی ہے۔ خود کو اس تناظر میں رکھ کر تاریخ سے بہتر عمرانی نتائج اخذ کیے جا
سکتے ہیں۔
آنکھ پر یقین سب سے بڑا وہم ہے۔ منظر آنکھ کے سامنے بھی
بدل جاتا ہے ضروری نہیں کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ہو بھی۔ بعض اوقات خواب
میں بھی انسان اپنے آپ کو چٹکی کاٹ کر تصدیق کرتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے
حالانکہ وہ سو رہا ہوتا ہے پھر آنکھ کھلنے پر کیوں حقیقت پر حقیقت کا گمان
کر لیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی ایک شفاف آبِ حیات کو پایاب دیکھا مگر اندر

اُترے تو کنارے پر ہی ڈوب گئے۔ جو امر دکھائی نہیں دیتا بظاہر زندگی محسوس ہونے پر بھی موت بن جاتا ہے۔

ایک چھتری کے نیچے دو مسافر چلتے ہیں تو دونوں ایک دوجے کیلئے اجنبی نہیں ہوتے۔ اسی غلط اندازے پر دو سائے باہم منزل کی تلاش میں منزل سے الٹی جانب بڑھتے رہے۔ انہیں راستے میں کئی قسم کے خیال آئے مگر انہیں تو چلنا تھا، وہ چلتے گئے۔ وہ کامیابی اور کامرانی کے مفہوم سے مکمل ناآشنا تھے وہ وہم میں بتلا رہے وہ سفرِ رائیگاں کی تجسیم نہ کر سکے، سفر کرتے کرتے انہیں سفر سے محبت ہو گئی اور یہی سب کچھ مقسوم تھا۔ دونوں غنی اور دونوں کا سر بدست ہر دو نے خیرات ڈالی نہ مانگی۔ غالباً محبت مغالطے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یا پھر سب کچھ ناممکن تھا۔

خُدا جانے ہمیں ناممکن کی ممکن سے زیادہ طلب کیوں ہوتی ہے۔ شاید ہم انکار کو اقرار میں بدل دینے کی خواہش میں زندہ ہیں۔ آسان حصولِ شوق اکتاہٹ یا شک کا باعث بنتا ہے۔ یہ مہم جوئی حقیقت میں اپنی ذات کے ادراک کی جانب آغازِ مسافرت ہے۔ یہ محسوسات کا علم ہے۔ یہ کوئی ٹو بیریکل قسم کی شے نہیں کہ طے شدہ اصول و ضوابط کے مطابق حل کر لی جائے یہ اور ہی قسم کا مضمون ہے جس میں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ اس میں مکمل ادھورا پن ارتقائے احساس کی تکمیل کرتا ہے۔ ارتقا کو روکا نہیں جا سکتا۔ ارتقا تخلیق کے نئے راستے کھولتا ہے! اور تخلیق کار کے زندہ رہنے کا جواز ہے۔

تخلیقی مرحلے میں Nostelgia سے عبرت اور رہنمائی حاصل کرنا دانشمندی ہے۔ میٹھی یادوں کی موجودگی، موجود کو مزید تلخ اور کڑوا کر دیتی ہے۔ ماضی میں واپس جانا تو خارج از امکان ہے ہی مستقبل کی جانب بڑھنا

بھی کوئی آسان نہیں۔ ماضی کو تاریخ کے طور پر پس منظر میں لکھ کر پیش منظر کی جانب دیکھا جا سکتا ہے۔ عہدِ رفتہ کو اساس بنایا جا سکتا ہے۔ مگر کسی منظر سے جڑنا مکمل توجہ اور انہماک کا مرہونِ منت ہے۔ ہر دو اطراف میں داخل اور خارج کے زیرِ اثر تبدیلیاں لازم ہو جاتی ہیں (یعنی اپنی موجودگی کی شہادت انفرادی اور مجموعی تناظر میں پیدا کرنا ہوتی ہے)

گم گشتہ ساعتوں کے وصال کے شوق میں گزشتہ کی جانب مسافرت کوئی Recreation نہیں۔ یہ نہایت کٹھن مرحلہ ہے اور مجبورِ عمل ہے۔ یہ تو ناآسودہ خواہشات اور نامراد آرزوؤں کی تجدید ہے۔ سوچ ایک جگہ نہیں ٹھہرتی۔ سوچ راستے، منزل بہ منزل زنجیر ہوتے جاتے ہیں۔ یادیں ان تیروں کی طرح ہیں جو کمان کی جانب پلٹتے ہیں اور ہم خوش گمانی میں گھایل ہوتے رہتے ہیں یہ احساسات کا کھیل وہم نہیں مگر حقیقت بھی نہیں۔ ہم اسے کچھ کہہ لیں مگر یہ گمان بھی نہیں۔

اگرچہ ہمارے پاس کوئی پیشین گوئی تھی مگر ہم جوشِ جنوں میں خواہشِ حصولِ ناممکن کے جرم کے مرتکب ہوئے اور سزا پائی کہ اسی کام میں جُتے رہیں۔ سودائے محبت ایک اندھی طاقت ہے، یہ وہ بھوت ہے جو اتارے نہیں اترتا۔ اور یہ وہ آتش ہے، کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے، مجنوں صحرا نوردی میں ریگِ رواں کی صورت صحرا کو الٹا پلٹتا رہتا ہے جب دل ایک جگہ ٹھہر جائے تو پھر پاؤں اپنی جگہ نہیں ٹھہرتے۔ شکستگی و واماندگی اسی امرِ بے قابو کا تتمہ ہے۔ لیکن حالات اثبات کی جانب سفر کرتے ہیں۔

جب آشیانہ نئے سرے سے بنتا ہے تو بجلیاں پھر سے چمکنے لگتی ہیں، آندھیاں ایک دفعہ پھر موسم کو غیر یقینی بنا دیتی ہیں۔ آتش ابر و باد

کے اس کھیل میں چاند تماشائی بنتا ہے مگر اسے کیا خبر کہ تماشائی ہی تو تماشے کا اصل حصّہ ہوتا ہے۔ بادلوں کے کسی اوٹ سے ستارے چاند کی تائید میں جھلملاتے ہیں۔ شجر ہائے سایہ دار اپنے قدموں میں سایوں کو اکٹھا کر کے رکھ لیتے ہیں۔ انہیں چاندنی کی موجودگی میں اپنے وجود کے انکار پر بھی ملال نہیں۔

زندگی کی دھوپ چھاؤں میں منظر بدلتے رہتے ہیں۔ غم اور خوشی، رنج اور راحت، شکست و فتح، کامیابی و ناکامی، آگ اور پانی کی طرح الگ الگ خواص رکھتے ہیں اور الگ رہتے ہیں مگر بامرِ مجبوری یکجا بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی منفی اور مثبت کشش سے حیات ہے۔ گویا پوری دُنیا اس پیراڈاکس کے مدار پر گھوم رہی ہے۔ تبھی تو ہمارے احساسات موسموں کے عروج و زوال سے بدلتے رہتے ہیں۔ گردشِ دوراں سے نمٹنے کے لیے طبیعت میں ٹھہراؤ اور مزاج میں ثابت قدمی ضروری ہے۔ ہمت راہِ حیات کا زادِ راہ ہے۔

تخلیق ایک ہی وقت میں دو انتہاؤں کی سمت سفر ہے۔ دو متضاد رویّے بیک وقت عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اعتدال دو متلوّن کناروں کی درمیانی وسعت میں کہیں کھو جاتا ہے۔ صحرا اور سمندر بھی اسی خلیج کا شکار ہیں۔ بظاہر یہ پھیلاؤ اپنی دسترس میں دکھائی دیتا ہے لیکن اسے سمیٹنا چاہو تو بکھر جاتا ہے۔ اصل میں یہ پھیلاؤ شش جہت پر محیط ہے۔ مگر تسبیہ اور تقدس سے بے نیاز فقیر اس وسعتِ دہر کو دل میں اُتار لیتا ہے۔

شہرِ جاں میں دل وہ عقوبت خانہ ہے جہاں ظالم، مظلوم اور ماتم کناں عشقِ واحد ہے (یہ دل کبھی خوشیوں بھرے آنگن کی طرح تھا۔ اب تو اس حویلی میں سوائے ویرانی اور اداسی کے کچھ نہیں) مقفّل حویلی میں عفریت براجمان ہے چھتوں اور دیواروں پر تارِ عنکبوت کا قبضہ ہے۔ گرد آلود ماحول نے سب کچھ

آسیب زدہ کر چھوڑا ہے۔ تبھی تو محسوسات پر طاغوطی طاقتوں کا تسلط ہے۔ اس حویلی کے سارے روشن دان بند ہیں کہ جن میں سے بادل چاند ہوا، اور میں اندر نہیں جھانک سکتے۔ یہ فطرت سے الگ ہونے کا عملی خمیازہ ہے۔ بے بسی اور بے اختیاری بالواسطہ آتی ہے۔ ہم نے بربادی کی راہ خود اختیار کی۔

نئی تعمیرات سے پرانا مکان اوجھل ضرور ہو جاتا مگر اپنی جگہ قائم ہوتا ہے۔ نقشہ بدل جانے سے راستے بدلنا پڑتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے ملاقات پیچیدہ عمل بنتا جاتا ہے۔ مَیں خود کو باہر تلاش کرتا ہوں، یعنی وہاں جہاں میں نہیں ہوں۔ گویا ناظر اور منظر کے بیچ کوئی غیر موجودگی ضرور ہے، غیر موجودگی کی تجسیم رُوحانیت سے تعلق رکھتی ہے اس لیے یہ سوال عام سطح پر لایعنی ہے۔ اس کی اساس جذبِ دروں پر ہے۔

ہوا پر لکھی گئی تحریر یا پانی پر پھینکی گئی ہوا اثر رکھتی ہے محبّت کے لمحات میں آیا ہُوا خیال، صورت حال کو بدل سکتا ہے۔ مسلسل بے سمت چلنے سے مسلسل منزل دور ہوتی جاتی ہے۔ بولتے بولتے ضروری نہیں کہ کوئی کام کی بات بھی کہی گئی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی صدیوں کے شور کی لایعنیت چشمِ بصیرت پر وا کر دیتی ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ "مجھے کچھ اور کہنا تھا" پھر سارے سیٹ اَپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ مکمل تبدیلی کی تاب لانا سب کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ معروض کا اندوہ ناک چہرہ عیاں ہو جاتا ہے۔

جب اپنی خوشیاں دوسروں کے لیے اور دُوسروں کے غم اپنے لیے جمع کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عمل کا دار و مدار ماورائی احساس پر ہے جو اپنے اصل میں metaphysical ہے۔ جہاں تمام جسمانی مشقتیں اجر سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ جسم غیر محسوس طریقے سے رُوح کا حصّہ بن جاتا ہے۔

اصل کا جواز نقل میں ضرور ہوتا ہے۔ ہماری تخلیق ایک سطح پر کسی
خیال کا پرتو ہے، خیال عکس ہے روشنی کا، روشنی احساس ہے حقیقت کا اور حقیقت
عین سچ ہے۔ پھر سچ حق کی تصدیق ہے۔ گویا ہم اصل سے many times away
ہیں۔ لیکن کچھ ہونا نہ ہونے سے ضرور بہتر ہے اور اسی میں زندگی کی
روح مضمر ہے اور غالباً یہ ہماری سوچ کا آخری جواز ہے مگر ہم نے تصورات
کی عمارت غلط فہمی اور خوش گمانی کے بنیادوں پر اٹھائی۔ پھر اس کے دروازوں
کی کلید عقل کے ہاتھ تھما دی۔ جذبہ اور عشق کم اہم یا غیر اہم ہوتے گئے۔ ہم نے
عقل کو جذبے کی اور جذبے کو عقل کی بنیاد پر رد کرنا شروع کر دیا۔

ہماری نیّت میں فتور آیا تو ہر کام بے برکت ہو گیا۔ کتاب نے اپنے
معنی چھپا لیے، تقریر نے اپنا اثر اندر جذب کر لیا اور محبّت نے خلوص اپنے پاس رکھ
لیا — رات عیاں ہو گئی تو چاند بے نور ہو گیا — رات ہاتھ لگی تو وہ بھی ادھوری
— یہ غم ہمارے حصے میں آیا کیونکہ ہم زوال کے دنوں میں پیدا ہوئے —
زوال کی سطح سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید احساسِ ندامت کی صورت میں کوئی
اُمید کی کرن آمدِ عروجِ سحر کا مژدہ سُنا دے۔

زوال کے دورانیے کی طوالت مَیں نے خود بڑھائی کہ جیسے میں
ذلّت بھرے اس موسم سے مانوس سا ہو گیا ہوں۔ رہائی ملنے پر مرنے کا کھٹکا
لگا رہتا ہے۔ مَیں عین مجرم ہوں کہ مَیں نے ارد گرد کی صُورت بدل کر رکھ دی ہے۔
مجھے جو آئینہ ملا، میں اسکی حفاظت نہ کر سکا۔ اب یہ کوئی تصویر ٹھیک سے نہیں
اٹھاتا۔ یہ وہ آئینہ نہیں کہ جب چاہا صیقل کروا لیا۔ یہ وہ آئینہ ہے کہ شکستہ ہو تو عزیز تر
ٹھہرتا ہے۔ مگر اس پتھر کو توڑنے کے لیے مسلسل اشک باری کی ضرورت ہے
یقیناً یہ آئینہ پھر سے پتھر ہو گیا ہے کہ اس میں تصویر نہیں بنتی۔

آئینہ حقیقت میں روشنی کا عکس ہے۔ روشنی کو منعکس کرنے والا بھی۔
پس آئینہ خود آرائی میں محو ہے۔ اسی لیے ہمیں اپنی صُورت پر کئی بار دور کا مشابہتی
گمان گزرتا۔ ہمارا چہرہ روشنی میں بنتا ہے وگرنہ اندھیرا ہمارا ہم رنگ ہے۔
روشنی ہماری پہچان ہے تو ہم روشنی سے کیوں ڈرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ
تاریکی میں چھپا ہوا عفریت ہمیں دیکھ رہا ہے۔ مگر ہم یہ نہیں سوچتے کہ روشنی
میں ہم خود کو بچا سکتے ہیں۔ ویسے بھی روشنی سے دوسری مخلوقات خوف زدہ
ہیں۔ حرفِ مقدس روشنی کی اعلیٰ ترین مثال ہے مگر یہ زیرِ معتبراب ہمارے پاس
نہیں رہا اسی لیے خالی ہاتھ کوئی نہیں مرنا چاہتا۔

ہر وقت ناگہاں موت کا دھڑکا، شامِ شہریار کا نشہ ہرن کرنے کے
لیے کافی ہے۔ چوراہوں میں موت کا رقص زندگی سے خراج مانگ رہا ہے۔
فاتح تو مفتوح سے خراج وصول کرے گا۔ اس خوف سے نکلنے کا حل جبینِ سجدہ
پر لکھا ہوا ہے۔ سب کچھ جانتے ہُوئے بھی ہم انجان بنے رہتے ہیں ہم سمجھتے
ہیں کہ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

معاشرے کے فرد کی حیثیت سے میں بھی شریکِ جرم ہوں اور
میرا جُرم بھی دوہرا ہے کیونکہ میں اپنے مفادات کے زیرِ اثر دشمن کے ہاتھوں
میں وعدہ معاف گواہ بن گیا ہوں۔ اس جرمِ کبیرہ کا ارتکاب بزدلی کی سب
سے بڑی مثال ہے۔ میں اپنے مکافات سے بے خبر محتسب کے ساتھ
ساز باز میں مصروف ہوں۔ میرے شب و روز برق رفتاری سے انجام کی
طرف دوڑ رہے ہیں اور میں سب کچھ پتھرائی ہُوئی آنکھوں سے تک رہا
ہوں۔ گنتی کے لمحے ریگِ خشک کی طرح مٹھی سے پھسلے جا رہے ہیں۔ سُوکھی ریت
ہاتھ سے پھسلے یا گیلی ریت پاؤں کے نیچے سے نکلے، معنی ایک سے رکھتی ہے۔

وقت گزرنے کا استعارا کوئی بھی ہو، مطلب نہیں بدلتا۔ وقت کو کون روکے۔ یہ خود بھی نہیں تھکتا کیونکہ اس کے پاؤں نہیں ہوتے اور اسی لیے یہ اپنے گزر جانے کا نشان بھی نہیں چھوڑتا ہم اسے اپنی ذات کی تبدیلیوں سے پہچانتے ہیں۔ اس تبدیلی کی پہچان ہی فنا کی پہچان ہے۔

ہماری بے بصری کے باعث سب کچھ جو ہمارے خلاف ہے' ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ ایک تو فضا ہمارے حق میں سازگار نہیں اور پھر ہم دشمنوں کے ساتھ مل کر اپنی مقدّس دھرتی میں سازشیں بو رہے ہیں۔ ہم امپورٹ کی گئی مٹی پر جبینِ نیاز رکھتے ہیں۔ ہماری اجتماعی سوچ کی فصل مکمل خشک سالی کا شکار ہے۔ اس کی جڑوں کو نفرت کا کیڑا لگ چکا ہے۔ ہماری منافقت سے بھری زندگی ہی ہمارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ ہم بیمار ہو کر دشمن کے کلینک میں مصنوعی سانس پر زندہ ہیں۔ شاید ہمارا زندہ رہنا عین مصلحتِ عدو ہے۔

ابھی ہمیں ختم کرنے کے تجربے کے سائڈ افیکٹس کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں۔ یہ کوئی نیا انکشاف نہیں یہ ایک open secrt ہے جسے بچہ بچہ جانتا ہے ہم آزاد ہو کر بھی غلام ہیں۔ دوسرے کی غلامی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ہماری حیثیت کا ادراک ہر شخص کو ہے۔ عرفانِ زیاں تو سب کو ہے احساسِ زیاں کسی کو نہیں۔ غیرت کی آخری ہلکی سی رمق کے طفیل احساسِ ندامت ماتھے پر شکن ڈال دیتا ہے۔ مگر ہم خندہ پیشانی سے جی رہے ہیں۔

اب تو آزادی کی باقیات چند جنونی بوڑھے ہیں جو تقسیم کے واقعات سُنا سُنا کر روتے رہتے ہیں کہ انہوں نے غلام زمین پر لہو سے آبیاری کر کے

آزادی کا پودا لگایا تھا اس پودے کے تن آور ہوتے ہوتے کتنی خونیں آندھیاں آئیں۔ ہم نے سب کچھ نہیں دیکھا، ہمیں اُن کی باتوں کی کیا قدر ہو۔ ہمارے لیے تو یہ غمگین سی داستانیں ہیں۔ خُدا نہ کرے کہ ہم اپنے تجربے سے سبق سیکھیں یہ بھیانک تجربہ ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہمیں سمجھانے کے لیے بہت کچھ لکھا گیا مگر بے سود۔ یا تو لفظ روشن نہیں، یا ہم سے بصیرت چھن گئی ہے پھر بھی رسماً ماتم ضروری ہے کہ جانے کب بابِ قبولیت وا ہو جائے! جانے کب حرفِ باریاب نصیب ہو جائے؟

قرطاسِ آسمان پر الفاظ کے مہر و ماہ اپنا راستہ خود نہیں بناتے، ان کے راستے متعین ہیں۔ ایک وہبی رہنمائی میں اپنے اپنے معنی مخصوص کرتے جاتے ہیں۔ گویا معنی کے orbit بناتے ہیں اور اپنی حدود میں مست ہو کر گھومتے ہیں۔ اپنی اپنی حدود و قیود کا عرفان دوسروں کی بقا کا ضامن ہے۔ اس عمل میں توازن کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ لفظ سچّے اور پُر اثر ہوں تو خیال کی تجسیم ان کے سحر کے زیرِ اثر ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ زمین نے آسمانی نظامِ فطرت سے روگردانی کی۔ اپنی آنکھوں پر مرضی کے رنگ کا کانٹیکٹ لینز لگا کر دُنیا کو دیکھا۔ یہ خود فریبی کی ابتدا تھی۔ پھر منظر سچ مچ انہی کے رنگ میں ڈھل گئے۔ غلط کام کو صحیح ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ سچ کو جھٹلانا بھی ایک متوازی عمل ہے۔

توجہ دھیان گیان کا پہلا زینہ ہے پھر جہاں بادل اشک چاند چہرہ، ہوا قاصد اور مَیں خاک ہو جائے، تخلیق کی صورت گری دکھائی دیتی ہے۔ ودیعت کی گئی اس خوبی کا استعمال کمالِ منصب کا متقاضی ہے۔ کچھ کہنے کا ہنر کثیر الجہات امتحان ہے۔ اپنے دیے ہوئے طے شدہ راستوں پر کسی فنکار کو نہیں چلایا جا سکتا۔

جو پابندیاں قبول کرتے ہیں وہ محض Carpenter ہیں ' Fra
Lippolippi کو مجبور کیا گیا کہ وہ بغیر جسم کے رُوح کی تصویر کشی کرے۔ وہ ساری
clergy کے دباؤ کے باوجود ایسا نہ کر سکا اور مقدّس مقام سے فرار ہوگیا۔

تخلیق ایک رحمت ہے اور اس میں ارتقا کا عمل انعام۔ کیونکہ اسی
صورت میں خوب سے خوب تر کی جستجو کی جاسکتی ہے۔ ایک حد پر ٹھہر جانا،
زوال کی طرف جانے کا اشارہ ہے۔ perfection موت ہے! ۔ یہی
المیہ Browning کے Andria Dil Sarto کا تھا۔ یہ ادھوراپن
آسان نہیں یہ سال با سال محرومیوں اور ناکامیوں میں رہنے کا اجر ہے۔ خلا جتنا
بڑھے گا، اتنی زیادہ تیزی سے ہوا اس جگہ کو پر کرنے کے لیے آئے گی۔

حصولِ علم کے ساتھ احساسِ کم مائگی شدید ہوتا جاتا ہے۔ اس بات
کو وہی محسوس کرتے ہیں جن کے اندر وسعت رکھی جاتی ہے کیونکہ ظرفِ قدح خوار
کے مطابق ہی مے ملتی ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثریت شوقیہ تخلیق کاروں کی ہے جو
تکمیل سے سفر شروع کرتے ہیں۔ حصولِ فن اور حصُولِ عیش و نشاط میں بہت فرق
ہے۔ فن، تخلیق کا سلیقہ ہے۔ یہ لفظی اور معنوی سطح پر بھی ہے تاہم اس کا وسیلہ
ماحول اور معاشرہ ہے۔ اپنی جہالت کو فن کہنا ایک الگ فن ہے۔ وگرنہ علم
کے بغیر حکمت و دانش مٹی کا وہ تیل ہے جو زمین کے اندر میلوں نیچے خام حالت
میں پڑا رہتا ہے۔

سعدُاللہ شاہ

۵۔ نومبر ۱۹۹۵ء

غزلیں

لب پہ اوڑھے مَیں پیاس رہتا ہُوں
کیا سمندر کے پاس رہتا ہُوں

حل نکالا ہے یہ اُداسی کا
اب مکمل اُداس رہتا ہُوں

○

مشکل کو سروں سے ٹالنے والا تُو ہے
مجھ کو مرے گھر میں پالنے والا تُو ہے

ہوں سیپ سمندروں میں اور ہوں خالی ہاتھ
موتی مری سمت اُچھالنے والا تُو ہے

نیچے میں دبا ہُوا ہوں پھر سے خواہشوں کے
اب چشمۂ جاں اُبالنے والا تُو ہے

ہر گام ہے سلسلہ نیا اک لغزشوں کا
ہر گام مجھے سنبھالنے والا تُو ہے

وقعت ہی مری ہے کیا کہ لکھوں تیری حمد
لفظوں کو مگر اُجالنے والا تُو ہے

ہے ربِّ کریم سعدؔ کو تجھ سے اُمّید
ٹہنی پہ ثمر نکالنے والا تُو ہے

ہر در مجھ پر بھی وا ہُوا ہے
تجھ سا رہبر کسے مِلا ہے

ملتا ہے اُسے ترے ہی صدقے
جو بھی ترا اُمّتی بنا ہے

بے سایہ نہیں ہُوں مَیں، مجھے بھی
کالی کملی کا آسرا ہے

یہ عشق کی بات ہے تبھی تو
سمٹا صدیوں کا فاصلہ ہے

تیرے ہی لیے بنا ہے سب کچھ
صدقے ہیں ترے ہمیں ملا ہے

نسبت ہے جو سعدؔ مصطفیٰؐ سے
مضبوط خدا سے رابطہ ہے

○

واسطہ یوں رہا سرابوں سے
آنکھ نکلی نہیں عذابوں سے

میں نے انساں سے رابطہ رکھا
میں نے سیکھا نہیں نصابوں سے

خوں جلایا ہے رات بھر میں نے
لفظ بولے ہیں تب کتابوں سے

میں اکیلا تھا اور تنہا تھا
شہر لایا ہوں اک خرابوں سے

رازِ ہستی تلاش کرنا ہے
بات بنتی نہیں شرابوں سے

تتلیاں جمگھٹے کی صُورت تھیں
رنگ اُڑتا گیا گلابوں سے

کتنا آسان تھا سوال کبھی
جان جاتی ہے اب جوابوں سے

مَیں بھی اپنی اَنا میں مست رہا
وہ بھی نِکلا نہیں حجابوں سے

سعدؔ سورج بنا جو مرکز تو
آسماں بھر گیا سحابوں سے

گھٹا تو کھُل کے برسی تھی مگر موسم نہ بدلا تھا
یہ ایسا راز تھا جس پر مری آنکھوں کا پردہ تھا

مرے دامن کے صحرا میں کئی جھیلوں کا قصّہ تھا
جو بادل کی زبانی مَیں ہواؤں کو سناتا تھا

جُنوں کی تیز بارش میں تجھے پانے کی خواہش میں
مَیں دل کی سطح پر اکثر کھُلی آنکھوں کو رکھتا تھا

نہیں ہوتیں ہمارے بس میں سب باتیں جو اپنی ہوں
رہی ہیں یاد وہ باتیں مجھے جن کو بھُلانا تھا

رُخِ ماہِ منور سے اڑیں زلفیں تو کیا نکلا
پسِ عکسِ گماں تو پھر وہی قصہ پرانا تھا

ہوائے بادو باراں سے مری نمناک آنکھوں تک
وہی بھیگا تصور تھا' وہی گُل رنگ چہرا تھا

اگرچہ سعد رستے میں بڑے دلکش جزیرے تھے
مجھے ہر حال میں لیکن سمندر پار جانا تھا

وہ ابرِ دردِ جاناں بھی مرے آنگن میں اُترا تھا
مرے دل کی منڈیروں پر گلابی پھول مہکا تھا

نہ خاموشی وہ پیڑوں کی نہ تنہائی وہ سڑکوں کی
ردائے شب سے اکثر میں ستارے چُنتا رہتا تھا

تُو نغمہ تھا پرندوں کا میں جھونکا تھا ہواؤں کا
مرے باعث ہی فطرت سے ترا یہ سارا رشتہ تھا

میں گہری نیند سویا تھا مجھے بادل اُٹھا لائے
میں اک ندی کنارے پر کسی وادی کا سپنا تھا

بہت کثرت تھی چیزوں کی بہت لذّت زباں میں تھی
مگر کچھ اور تھا دل میں جسے میں نے سنبھالا تھا

اگرچہ ٹھیک ہے یہ بھی مخالف تھے سبھی اپنے
مگر دورِ جنوں میرا بہت ہی جان لیوا تھا

حقیقت سعدؔ ایسے ہے کہ دشمن پھر بھی دشمن ہے
اِسی خاطر تو مَیں نے بھی کماں میں تیر رکھّا تھا

○

نہ لہروں میں اُٹھانیں تھیں نہ پُورا چاند نکلا تھا
ہَوا نے بادبانوں پر کوئی طوفان لکھّا تھا

کسی ڈر سے کسی شک میں اُسے مارا تھا اپنوں نے
سمندر کا شناسا بھی نہ جانے کتنا گہرا تھا

جب آئی موج ساحل پر تو لوگوں نے صدائیں دیں
پلٹتے پانیوں میں بھی مجھے پاؤں جمانا تھا

لُڑھکتا آرہا تھا مَیں بڑی اُونچی چٹانوں سے
تباہی تیری بستی کی تو بے قابو نتیجہ تھا

بھری تھی مجھ میں بے چینی کسی بے نام چاہت کی
مَیں تنہائی سے گھبرا کر جو اپنے گھر سے نکلا تھا

طلسمِ جاں سے باہر بھی سحر انگیز منظر تھے
مئے فطرت نے سوچوں کو عجب جھولا جھلایا تھا

ابھی تک یاد ہے مجھ کو وہ لہروں کا تسلسل بھی
سفینہ سعد کیسا تھا جو اُبھرا تھا نہ ڈوبا تھا

نہ اُس میں کوئی منطق تھی نہ اُس میں کوئی دھوکہ تھا
مری خاطر ہی نکلا تھا جو دانہ میں نے کھایا تھا

حصولِ رزق میں دن بھر نزولِ فکر میں شب بھر
دھواں بن کر میں اُڑتا تھا فغاں بن کر میں جلتا تھا

بڑھا دیتی ہیں عمروں کو نہ جانے یہ کتابیں کیوں
میں چھوٹا تھا مگر سر پر کئی صدیوں کا سایہ تھا

صدائے بازگشت اُس کی مجھے ہر سمت سے آئی
وہ داعی تھا محبت کا جسے تم نے نہ جانا تھا

مجھے حیران رکھتی تھی سمندر کی بھری وسعت
اور اس کے بعد جب دل میں یہ منظر بھی سمٹتا تھا

چلا آئے گا گوہر بھی خود اپنے آپ ساحل پر
تصوّر میں یہی لمحہ ہمارے ساتھ رہتا تھا

کبھی جب سعد اُبھرا تھا کوئی کالی گھٹاؤں میں
مگر پھر مثلِ شبنم کیوں وہ قطرہ قطرہ برساتھا

○

وہ سُورج کا نکلنا تھا، وہ برفوں کا پگھلنا تھا
وہ تیرا میرا ملنا تھا، بہاروں نے بھی دیکھا تھا

یہی طبعِ رواں تھی جو ہمیں آوارہ رکھتی تھی
اسی آوارگی میں ہم کو اپنا گھر بسانا تھا

جواں جذبے جوانی میں، رہے میری کہانی میں
مری آنکھوں کے پانی میں ہمیشہ چاند ٹھہرا تھا

کہا جو کچھ روانی میں، کُھلا اپنے معانی میں
مری شُستہ بیانی میں مرا لہجہ انوکھا تھا

شبِ فرقت تری باتیں تری یادیں ستاتی تھیں
مجھے اس حال میں ماضی بھی کتنا اچھا لگتا تھا

اسے من میں بسانا بھی اسے دل سے بھلانا بھی
اِنہی بے کار کاموں میں مجھے مشغول رہنا تھا

مجھے اُس سے ہے لینا کیا وہ ایسا ہے کہ ویسا ہے
"بتاؤ سعدؔ کیسا ہے"، کبھی اُس نے یہ پوچھا تھا

○

ہمارا عشقِ لاحاصل بلندی تک بھی پہنچا تھا
کبوتر کے پروں کے ساتھ ہم نے دل کو باندھا تھا

وہ پتھر تھا، مَیں شیشہ تھا، نتیجہ کیوں نہیں نکلا
اُسے ٹھوکر لگانا تھی، مجھے بھی ٹوٹ جانا تھا

بہت نے خاک چھانی پر نہ وہ یوں خاک ہو پائے
بلندی جنکی قسمت تھی، وہی راہوں میں اُڑتا تھا

جہاں وہ اتنا بھولا تھا، وہاں کچھ یاد بھی رکھتا
فقط اتنا تو کہہ دیتا کہ اس نے مجھ کو چاہا تھا

ہوائے غم مری جانب سبھی اطراف سے آئی
خوشی کا ایک پل گویا کوئی اُڑتا بگولا تھا

بس اک اتنا سمجھنے میں بہت مدت لگی مجھ کو
ضروری تو نہیں ویسا کہ جیسا میں نے چاہا تھا

ہمارا عشق کب کھلتا کسی پر سعدؔ ایسے ہی
یقیں مانو کہ ہم نے خود زمانے کو بتایا تھا

○

ہو جاتی ہیں ساری باتیں آ کر میری بات میں گُم
سب کچھ مجھ سے باہر ہے اور میں ہوں اپنی ذات میں گُم

رات پڑے تو ساری شکلیں آنکھ میں چھپنے لگتی ہیں
ڈھلتے ڈھلتے دن بھی آخر ہو جاتا ہے رات میں گُم

آنکھیں خشک ہیں لیکن اب کے میں اشکوں میں ڈوبا ہوں
میں اک ایسی بدلی ہوں جو بِن برسے برسات میں گُم

ممکن بھی ناممکن ہے اور ناممکن بھی ہے ممکن
ایسے ہی حالات ہیں میرے اور ہوں میں حالات میں گُم

اے دل اُس سے مل کر اب میں خود کو کیا محسوس کروں
جیسے ویرانوں کی خوشبو ہو جائے باغات میں گُم

سُن کر اپنے نغموں کو میں اور بھی کچھ بے حال ہُوا
سوچا تھا دل کی بے چینی ہو جائے نغمات میں گُم

جس کو اپنے ہاتھوں کھویا اس کو کہاں اب ڈھونڈوں میں
وہ تھی لکیر مِری قسمت کی اور ہُوئی مِرے ہات میں گُم

میں تو سعدؔ ہُوں اُجڑا راہی کیسا میرا حال ہوا
مُستقبل اندیشوں میں ہے ماضی ہے جذبات میں گُم

(۷)

اپنی قسمت میں لکھی رات یہ کالی دیکھی
مَیں نے فنکار کی دُنیا میں بھی گالی دیکھی

مجھ کو اُڑنا تھا بہت دُور سبھی کی خاطر
خود سے اُلجھا تو شکستہ پر و بالی دیکھی

ایک وہ آنکھ کہ بس جس میں سمایا نہ کوئی
اِک وہی آنکھ کہ پھر ہم نے سوالی دیکھی

تجھ کو سنجیدہ سی باتوں سے بھلا کیا مطلب
تُو نے دربار میں بجتی ہُوئی تالی دیکھی

جی میں آیا تھا کہ آزادی کا تشن دیکھوں
آنکھ منظر سے گری ہاتھ کُدالی دیکھی

سعد میرے ہی سخن سے سبھی منظر جاگے
جو بھی دیکھی وہی تصویر خیالی دیکھی

دو شعر

اپنی تیغِ انا کا خود ہی گھائل مَیں ہوں
سچ پُوچھو تو اپنی راہ میں حائل مَیں ہوں

دِن پھرتے ہی بھُول گیا تھا سب کچھ کیسے
دیکھو اسکی جانب پھر سے مائل مَیں ہُوں

دو شعر

دیکھنا ہے جب تلک سورج نہ ڈھل جائے گا سعدؔ
کیا خبر یہ سایہ ہی ہم کو کچل جائے گا سعدؔ

وہ تمھارا دوست ہے لیکن ذرا سی احتیاط
کون جانے، کس جگہ کوئی بدل جائے گا سعدؔ

اُترا آتا ہے فضاؤں سے خزاؤں کا ہجُوم
اُمڈا آتا ہے مرے دل سے وفاؤں کا ہجوم

ہوں اکیلا جو سرِ شاخ تو ڈرنا کیسا
آئے، آتا ہے اگر سرخ ہواؤں کا ہجُوم

لاتعلق تھے سبھی واں، میں خبر کیا دیتا
ایک وحشت تھی وہاں اور خداؤں کا ہجُوم

بات جیسی بھی تھی پہلے تو بصارت تک تھی
مجھ کو بہرہ ہی نہ کر دے یہ صداؤں کا ہجُوم

آسماں سر پہ اُتر آئیں گے آخر اک دن
ایسے لگتا ہے کہ مجھ پر ہے رداؤں کا ہجوم

سعد برکت ہے یہ مٹّی میں تبھی تو ایسے
اُترا آتا ہے یہ سونے سی شعاعوں کا ہجوم

○

درد شوقِ نہاں سے اٹھتا ہے
آسماں آشیاں سے اٹھتا ہے

دل میں حق کے چراغ جلتے ہیں
جب دُھواں بادباں سے اٹھتا ہے

کون جانے کہ میرے دل کا لہُو
حرف بن کر زباں سے اٹھتا ہے

خوب ہوتی ہے جب لچک پیدا
تیر اپنی کماں سے اٹھتا ہے

وقت بینا ہے دیکھ لیتا ہے
کون کیسے کہاں سے اٹھتا ہے

زخم جس جا نہیں لگا کوئی
درد اب کے وہاں سے اٹھتا ہے

دل میں گرمی ہے سعدؔ سُورج کی
ایک شعلہ بیاں سے اٹھتا ہے

○

آنکھ کو اک جہان دے کر
رنگ پھینکے زبان دے کر

اُس کو کچھ تو بنا دیا ہے
ہم نے تھوڑا سا دھیان دے کر

جسم اپنا وہ لے گیا ہے
عمر بھر کی تھکان دے کر

چاہتا ہُوں یہ دُنیا زدیں
خواہشوں کو کمان دے کر

حُسن تلوار کو چھپایا
چاہتوں کی میان دے کر

خود میں محصور ہو گیا ہوں
خواہشوں کو امان دے کر

خود ہوئے ہیں شکار دیکھو
دوستوں کو مچان دے کر

سعدؔ ڈرتا ہوں جل نہ جاؤں
خود کو اتنی اُڑان دے کر

○

نیند سے جب شباب نکلا
جاگنا پھر عذاب نکلا

جس کو ڈھونڈا تھا پانیوں نے
وہ تو اک سنگِ آب نکلا

ایک کانٹا چبھا جو دل میں
ساتھ اس کے گلاب نکلا

جھیل چاندی سے بھر گئی تھی
عکسِ جاں ماہتاب نکلا

کیسے چھُپتا ہے کوئی جذبہ
پانیوں سے حباب نکلا

ہر ستارہ تھا حرفِ روشن
آسماں بھی کتاب نکلا

اشک بن کر غبار دل کا
نکلا اور بے حساب نکلا

کچھُ ادھُوری تھیں اپنی باتیں
کچھُ وہ حاضر جواب نکلا

○

کس نے ڈھلتا شجر دیکھا ہے
سب نے اُس کا ثمر دیکھا ہے

مَیں نے دن کے ہاتھ میں کل شب
کالی رات کا سر دیکھا ہے

زندہ لاشیں ناچتے کوّے
مَیں نے خواب نگر دیکھا ہے

دیکھو اب کیا بنے ہمارا
ہم نے تو سب کچھ کر دیکھا ہے

دن کو رات سجا لے گی اب
رات نے رنگِ سحر دیکھا ہے

آنکھوں میں اِک جنگل رقصاں
ہم نے مور کا پر دیکھا ہے

سعدؔ اب شہر بسانے والا
ہم نے شہر بدر دیکھا ہے

○

اُس کی ذات حوالوں تک تھی
گزرے بیتے سالوں تک تھی

اُس کے پاس جواب نہیں تھا
ساری بات سوالوں تک تھی

بنجر پن کو توڑا اُس نے
وہ برسات جو گالوں تک تھی

مَیں نے غزل کو وسعت دی ہے
یہ تو صرف غزالوں تک تھی

پھول کھلے تو ہم نے دیکھا
خوشبو پری جمالوں تک تھی

اُس کو کوئی بھی دیکھ نہ پایا
ہر اک سوچ مثالوں تک تھی

تاریکی میں کیسا تکتا وہ
جس کی آنکھ اُجالوں تک تھی

سعدؔ! یہ اپنی ہستی بھی تو
اپنے چاہنے والوں تک تھی

○

لوگ سر اُٹھانے میں
آ گئے نشانے میں

ٹوٹے پر سمیٹیں گے
ہم بھی آشیانے میں

بات جانے کیسی ہو
داستاں سُنانے میں

رابطے نہیں رہتے
رابطے بڑھانے میں

گھر اُجڑ ہی جاتے ہیں
بستیاں بسانے میں

خُود ہی دل رکاوٹ ہے
دل کا درد جانے میں

دشمنی بھی آتی ہے
دوستوں کے آنے میں

سعدؔ اک حقیقت ہے
تیرے اِس فسانے میں

○

ایسے لگتا ہے کسی کا بھی قصیدہ لکھنا
جیسے خود کو ہو کسی آس پہ جھُوٹا لکھنا

دستِ دیگر پہ نہ آ جائیں منافق سارے
میرے دشمن سے کہو سوچ کے دعویٰ لکھنا

ہار بھی جاؤں اگر میں تو کوئی بات نہیں
منصفِ وقت! مجھے قول کا پکّا نہیں

گر اُٹھائے ہیں یہ ہاتھوں پہ چراغوں سے حروف
کوئی نکلے جو سفر پہ تو سویرا لکھنا

سازشیں کرنے سے کچھ بھی تو نہیں ہو جاتا
نام اُس کا نہیں مٹتا جسے آیا لکھنا

میری تخلیق شماری میں نہیں فائدہ کچھ بھی
تجھ کو توفیق ملے تو کبھی پڑھنا لکھنا

سعدؔ لہجے میں جو تلخی ہے کسی رنج سے ہے
مجھ کو آتا نہیں جگنو کو ستارہ لکھنا

○

پھول خوشبو کو ہوا میں ذرا گہرا لکھنا
سات رنگوں میں کبھی اُس کا سراپا لکھنا

تتلیاں رنگ لیے پھرتی ہیں چاروں جانب
کتنا مشکل ہے بہاروں کا قصیدہ لکھنا

شب ستاروں کی زمیں پر اسے لے آنا کبھی
چاند کرنوں سے پھر اس شخص کا چہرا لکھنا

چاندنی رات میں یوں سوچتے رہنا اس کو
چاند اشکوں میں بھگو کر اُسے پیارا لکھنا

مَیں ہوں، پانی کا سفر اور مسافت لمبی
چشمِ حیراں تُو اُسے ایک جزیرہ لکھنا

سعدؔ اچھا نہیں لگتا مجھے رسمًا ملنا
دُور رہنے کا سبب لکھنا تو اتنا لکھنا

سَحر بن کے آنکھیں کُھلیں تو حقیقت کا پُورا سبق داستاں ہو گیا
یہ کیا ہے، محبّت میں اِک شخص کی اپنا سارا سفر رائیگاں ہو گیا

کہاں تک سنو گے زمیں سے زمیں تک مری داستانِ کمالِ عروج
مَیں پہلے حصارِ بدن میں رہا پھر اسیرِ زمان و مکاں ہو گیا

کہاں ہم نے کھوئیں بشارت کی راتیں جوانی کی باتیں مرے ہم نوا
نہ خوابوں کی خوشبو نہ پریوں کے میلے سبھی اپنا وہم و گماں ہو گیا

بساطِ ہنر سے جنُونِ طلب تک مَیں ٹُوٹا ہوں کیسے تمھیں کیا خبر
مَیں دل کی حدوں سے جو آگے گیا تو مرے ساتھ گُم اک جہاں ہو گیا

زمانے کی اُلجھن میں دل کی گھٹن بھی بہت جان لیوا ہوئی جس سمے
تجھے ہم نے سوچا تو دیکھا کہ پل بھر میں کتنا ہی پیارا سماں ہو گیا

اگرچہ کہیں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ایسے کہ جیسے ہوا ہے یہاں
ابھی پھُول کھلنے لگے تھے کہ گلشن کا گلشن ہی نذرِ خزاں ہو گیا

ابھی چاند پہنے ہے بادل کی چادر ابھی سعدؔ ٹھہرو گھڑی دو گھڑی
بڑی جلد بازی ہے تجھ میں مری جاں ہُوا کیا جو منظر دھواں ہو گیا

○

سوتے رہنا دیر تک
روتے رہنا دیر تک

ایک فصلِ بے ثمر
بوتے رہنا دیر تک

بوجھ اپنی ذات کا
ڈھوتے رہنا دیر تک

خود بخود اِک کام کا
ہوتے رہنا دیر تک

شب سفر پہ چاند کو
کھوتے رہنا دیر تک

جاگنے کی آس میں
سوتے رہنا دیر تک

سعدِ عیبِ دوستاں
دھوتے رہنا دیر تک

○

خانۂ چشم میں بس ایک ہی پیکر ٹھہرا
جس کو چاہا مرے دل نے وہی آ کر ٹھہرا

میں نکل آیا تھا جنگل سے سرِ شام مگر
خوف ایسا تھا کہ سائے کے برابر ٹھہرا

جس میں ٹھہرا نہ کبھی بھی کسی ساعت کا سکوت
میرا مسکن بھی وہی گنبدِ بے در ٹھہرا

کاٹ ڈالا ہے مجھے خشک ہوا نے کیسے
ریت کی طرح بکھرنا ہی مقدّر ٹھہرا

اِک بھیانک سا کوئی خواب تھا پس منظر میں
میرا سایہ بھی جہاں میرا شناگر ٹھہرا

دل جو آنکھوں سے مری برسرِ پیکار ہوا
میری آنکھوں میں نگاہوں کا تھا لشکر ٹھہرا

مَیں مقابل جو ہوا اپنے تو یہ خُوب ہوا
بعد اس کے نہ مرا کوئی بھی ہمسر ٹھہرا

سعد پڑھ لیتا ہُوں اُڑتے ہُوئے رنگوں کا مزاج
حُسنِ تخیئل ہی اس میں مرا رہبر ٹھہرا

○

وہ جو ضِدّی تھا بہت مَیں بھی تو خُود سَر ٹھہرا
مسئلہ اور بگڑنا ہی مقدّر ٹھہرا

مَیں تو ساحل تھا جو چلتا بھی تو کیسے چلتا
وہ بھی موجوں کی طرح آیا تو پل بھر ٹھہرا

چاند پگلا تھا چلا آیا جو میری جانب
مَیں تو بادل تھا ہمیشہ ہی سے بے گھر ٹھہرا

وہ چلا آیا خیالوں میں حنا کی صُورت
رنگ دینا تھا اُسے اور مَیں پتّھر ٹھہرا

مَیں تو بارش ہوں برس جاؤں گا قطرہ قطرہ
وہ تو کچھ اور ڈھلے گا کہ جو مَرمَر ٹھہرا

کوئی دیکھے تو ذرا اُس کی کرشمہ سازی
دِل میں رہتے ہُوئے کیسے ہے وہ باہر ٹھہرا

سعدؔ کچھ ہم بھی جنُونی تھے وفا کرنے میں
اور کچُھ اس کی جفاؤں میں تواتر ٹھہرا

سعدؔ پھُولوں سے سجاتا کبھی آنگن لیکن
وہ تو غیروں کی طرح سوچ کے دَر پر ٹھہرا

○

سُوکھی شاخیں، زرد پرندے، سات سمندر لکھّوں گا
لِکھنے بیٹھا ہُوں تو پھر مَیں کالے پتّھر لکھّوں گا

شام کا منظر کھل جائے گا سُونے قبرستانوں پر
اب مَیں ایک حقیقت بن کر مست قلندر لکھّوں گا

دِل کی دُنیا جیتنے والو آؤ مل کر ساتھ چلیں
مَیں فنکار ہُوں نام تمھارے لاکھ سکندر لکھّوں گا

اتنے سستے دَور میں یارو ایسا بھی تو ممکن ہے
باہر ہوگا نام کسی کا اور مَیں اندر لکھّوں گا

اس کی محبت کے رستے سے اپنے من تک پہنچا ہوں
اس کو جب بھی لکھوں گا میں اپنا من در لکھوں گا

یہ نہ سمجھ میں بھول گیا ہوں تیری وفا کے سب قصّے
ذرا ٹھہر مجھے تیری ہر اک بات ہے ازبر لکھوں گا

سعدؔ محبت کرتا ہوں میں لوگ مجھے پہچانیں گے
کب میں جادو جانوں گا اور کب میں منتر لکھوں گا

○

تھا خیالِ ازدحام
یوں رہا میں ناتمام

انتسابِ آدمی
بس خدایا تیرے نام

پھر گمانِ ابتدا
پھر یہ کیسا اختتام

ہے کمالِ روح یہ
واہ جسم کا مقام

خود سے میری دوستی
خود سے میرا انتقام

مہر و ماہ پی گئے
رات دن ملا کے جام

ہم نے بھی وہی کیا
کام، کام اور کام

کاش اپنے ساتھ ہی
سعدؔ گزرے ایک شام

○

مُوج میں آ کر جب بہتے ہیں بادل چاند ہُوا اور مَیں
تنہا تنہا کیوں رہتے ہیں بادل چاند ہُوا اور مَیں

دیواروں کی محفل میں تنہائی ناچنے لگتی ہے
اِن لمحات کا دُکھ سہتے ہیں بادل چاند ہُوا اور مَیں

اب کے شہر کے بُرجوں پر بھی خونی آنکھیں رکھی ہیں
شہر کا نوحہ بھی کہتے ہیں بادل چاند ہُوا اور مَیں

سبز رُتوں کی جھلمل میں جب شاخیں پھول اٹھاتی ہیں
بہکے بہکے سے رہتے ہیں بادل چاند ہُوا اور مَیں

تارے بن کے چمکتی ہیں جب اس کی یادیں پلکوں پر
جھیل سی آنکھوں میں بستے ہیں بادل چاند ہوا اور میں

آنکھیں بن کر دیکھ رہے ہو تم بھی قیدی لوگوں کو
روشن دانوں سے کہتے ہیں بادل چاند ہوا اور میں

○

لب پہ اوڑھے میں پیاس رہتا ہوں
کیا سمندر کے پاس رہتا ہوں

حل نکالا ہے یہ اُداسی کا
اب مکمل اُداس رہتا ہوں

اُس سے مل کر بھی کچھ نہیں کہتا
میں بھی کیا بدحواس رہتا ہوں

جہاں پھولوں کو کھلنا تھا وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا

تمہیں تو دُکھ ہی مِلنا تھے تمہی نے صبر کھینچا تھا
تمہارے لب کسی لمحے اگر ہِلتے تو اچھا تھا

بڑی مشکل تھی دشمن بھی مری خاطر وہاں پہنچے
بلا سے زخم بڑھ جاتے نہ یوں سِلتے تو اچھا تھا

کٹی ہے سعدؔ کی تم بن مگر اتنی سی ہے دِل میں
اگر آتے تو اچھا تھا اگر مِلتے تو اچھا تھا

کیسے سمٹے گی نوا کے اندر
رُوح خوشبو ہے ہَوا کے اندر

درد بڑھ جائے جو اپنی حد سے
لُطف آتا ہے سزا کے اندر

پھر جو مانگا تو اُسی کو مانگا
وہ بھی یاد آیا دُعا کے اندر

جھانکتا کون گلی میں گھر سے
ایک وحشت تھی صدا کے اندر

وہ جو لپکا ہے لہو سے میرے
ایک شعلہ تھا گھٹا کے اندر

کون جانے کہ یہ بندہ کیسے
ٹوٹ جاتا ہے انا کے اندر

سعدؔ کچھ بھی نہیں میرے گھر میں
چاند اُترا ہے خلا کے اندر

○

یہ نہیں ہے کہ سمجھتے ہی نہیں کچھ
یوں کہو ہم اسے کہتے ہی نہیں کچھ

اشک آتے ہیں مری آنکھ میں لیکن
دل کی حدّت میں وہ بہتے ہی نہیں کچھ

ہم نے مانا کہ ہو نازک بھی بہت تم
کیوں مگر اتنے کہ سہتے ہی نہیں کچھ

○

آنکھ لڑ جائے تو پھر چین بھی ملتا کب ہے
تیر لگتا ہے جو سینے میں نکلتا کب ہے

جسم کانٹوں سے بھرا ہے مری اُمیدوں کا
وہ جو اک پھول ہے اب دیکھیے کھِلتا کب ہے

کام بگڑا ہے طبیبوں کی پریشانی سے
ہاتھ ملتے ہوں تو پھر زخم بھی سِلتا کب ہے

میرے شعروں نے مرا ساتھ دیا ہے ورنہ
سعدؔ غمِ یار کا ہر ایک سے جھلتا کب ہے

○

قصّۂ عشق اسے ہم نے سُنایا ہی نہیں
کیا کہیں اپنی طبیعت کو یہ بھایا ہی نہیں

ہم کو فرصت کے کئی سال ملے ہیں لیکن
خود سے ملنے کا کبھی ذہن میں آیا ہی نہیں

دل کسی اور ہی جانب رہا مصروفِ عمل
اس لیے اپنی طرف ہم کو وہ لایا ہی نہیں

اِک دیا تھا جو سُلگتا ہی رہا آخرِ شب
دیر تک اُس کو ہواؤں نے بجھایا ہی نہیں

اپنے ہونے کا جو احساس دیا ہے اُس نے
اِس کا احسان کبھی اُس نے جتایا ہی نہیں

سعدؔ چاہا جو اُسے، پھر تو اسی کو چاہا
اپنا معیار کبھی ہم نے گرایا ہی نہیں

○

ہم کہ روئے بھی نہیں اور رُلایا بھی نہیں
یہ تماشا تھا تو دُنیا کو دکھایا بھی نہیں

ایک سایہ ہے مجسّم مری اُمّیدوں کا
وہ جو میرا بھی نہیں اور پرایا بھی نہیں

جب صداقت ہی نہیں اس میں تو کیونکر کہنا
ہم نے اُس درد کو سینے سے لگایا بھی نہیں

حق پہنچتا ہے کسے، روک کے پُوچھے اُس سے
آپ نے خود کو چھپایا تو بتایا بھی نہیں

بے بسی میں یہ ہُوا ظلم کہ ہم نے اُس کو
یاد رکھّا بھی نہیں اور بھلایا بھی نہیں

حُسنِ تخئیل میں ہوتی ہے اُلٹ سی منطق
جس کو کھویا نہیں ہم نے اُسے پایا بھی نہیں

سعدؔ ممکن تھا کہ وہ راہ پہ آ ہی جاتا
سچ تو یہ ہے کہ اُسے ہم نے منایا بھی نہیں

○

تم اپنے دل میں دیکھو تو وہاں اک فرد رہتا ہے
اور اُس اک فرد کے دل میں تمہارا درد رہتا ہے

عجب ہے آتشیں لاوا جو پھٹتا ہے تو پل بھر میں
مگر جب سرد رہتا ہے تو صدیوں سرد رہتا ہے

مری دیرینہ خواہش ہے کہ مستقبل ہو ماضی سا
مگر اک حال رستے میں مثالِ گرد رہتا ہے

مری آنکھیں تمہاری ہیں مگر ان میں نہیں ہو تم
جو چہرہ ان میں رہتا ہے بہت ہی زرد رہتا ہے

ترس مجھ پہ جو کھاتے ہو تو یہ بھی میں سمجھتا ہوں
کہ ہر عورت کے اندر بھی چھپا اک مرد رہتا ہے

چھپائے تُو ہزار اس کو مگر یہ اک حقیقت ہے
کہ دل میں سعدؔ تیرے بھی کسی کا درد رہتا ہے

○

خامشی بھی آپ کی
راگنی بھی آپ کی

کہہ رہی ہے کچھ نہ کچھ
اَن کہی بھی آپ کی

لو ہُوئی پھر آج سے
شاعری بھی آپ کی

مجھ میں اک کمی سی ہے
اور کمی بھی، آپ کی

حیرتوں کا آئنہ
ساحری بھی آپ کی

ہم نہ دیکھ پائیں گے
بے بسی بھی آپ کی

سعدؔ چاند آپ کا
چاندنی بھی آپ کی

○

کسی پہ کیسے کوئی اعتبار کر کے چلے
بڑھے عدو بھی جو ملنے کو وار کر کے چلے

ہمارا کیا ہے بھٹکتے پھریں گے راہوں میں
مگر ارادۂ منزل تو یار کر کے چلے

بچے وہی تھے بچاتے جو دوسروں کو رہے
وہ مر گئے تھے جو دریا کو پار کر کے چلے

مزہ تو تب تھا کہ دو جوں کے واسطے کرتے
اگرچہ کام تو ہم بھی ہزار کر کے چلے

شعور اس کو نہیں مانتا نہ مانے سعدؔ
ہم ایسے لوگ خزاں کو بہار کر کے چلے

مواقع ہم کو میسّر ہزار ہیں لیکن
مگر جو سعدؔ دنوں کو شمار کر کے چلے

○

کھیل میں اُلٹی سمت بھی جایا جا سکتا تھا
اُس کو سیدھی راہ پہ لایا جا سکتا تھا

وہ جو بات نہیں سمجھا تو برہم کیوں ہوؤں
اپنے آپ کو بھی سمجھایا جا سکتا تھا

ہمیں محبّت کا جو آسرا سا مل جاتا
ہر نفرت کا بوجھ اُٹھایا جا سکتا تھا

پیار کا مَیں اظہار نہ کرتا تو مَر جاتا
سچ کو دِل میں کیسے چھپایا جا سکتا تھا

اچھا ہے جو ہم نے کوئی عہد نہ باندھا
ورنہ کیسے عہد نبھایا جا سکتا تھا

پاس رکھا ہے ہم نے آنکھوں کی حُرمت کا
ورنہ اس کو بھی ٹھکرایا جا سکتا تھا

کہہ لو پیار کو ایک حماقت لیکن پھر بھی
ایسی حماقت کو دُہرایا جا سکتا تھا

ہم نے وقت گزُرنے پر ہی سوچا کیوں ہے
شاید پہلا قدم اُٹھایا جا سکتا تھا

درد میں اور جو بہل جائے
وہ طبیعت کہاں سنبھل جائے

خشک پیڑوں کی تالیاں سُن کر
زرد موسم نہ پھر بدل جائے

اُس کی جھولی میں تارے بھر دوں گا
میرے گھر میں جو شام ڈھل جائے

کاش موسم ہی اسکے چہرے پہ
رنگ دل کا ہمارے مل جائے

کتنا نازک ہے وہ پری پیکر
جس کا جگنوُ سے ہاتھ جل جائے

سعدؔ دل بھی عجیب سی شے ہے
کچھ نہ دیکھے جہاں مچل جائے

○

دو شعر

مُجھ کو جو ہر کسی سے یُونہی اختلاف ہے
شاید حقیقتوں سے مرا انحراف ہے

مَیں مانتا ہُوں ٹھیک ہے اُس کا نہیں قصُور
لیکن حضُور ہاتھ ہمارا بھی صاف ہے

قطعہ

ساتھ ساتھ روتی ہے
ساتھ ساتھ ہنستی ہے

سعد دھیان کر دینا
رنگ بھی بدلتی ہے

○

دل کی بلندیوں کا جو ادراک ہو گیا
آنکھوں سے سنگ گرتے ہی بس خاک ہو گیا

اک لہر ہے جو سر سے اُترتی ہے پاؤں تک
ہے اک حباب گر کبھی بے باک ہو گیا

کیسا خیالِ یار ہے، کیسا وجودِ غم !
دامن اک آئینے کا فقط چاک ہو گیا

سب کچھ جو بچ گیا تھا ہمارے حساب میں
سیلِ زماں کے سامنے خاشاک ہو گیا

یہ غم وہ آگ ہے کہ کرے سنگ کو بھی آب
دل، آنکھ دیکھتے ہی تو غمناک ہو گیا

اے سعدؔ لطف یہ ہے کہ وہ بھی ہوا ہے چاک
اِک بانکپن جو عشق کی پوشاک ہو گیا

○

رستہ بدل گیا رستہ بدلنے ہی
گھر بھی نہیں رہا گھر سے نکلنے ہی

کرتے تو کس طرح خاموش چاہتیں
جذبے مچل پڑے اشکوں میں ڈھلنے ہی

کچھ سخت تھی زمیں اس آب و خاک کی
پاؤں پھسل گیا اپنا تو چلنے ہی

جلتی ہے کس لیے کس کا ہے انتظار
پروانہ اُڑ گیا، اے شمع! جلنے ہی

اس دل کی بات پر مجھ کو یقین نہیں
ہوگا اُداس پھر، فوراً سنبھلنے ہی

اِک خوف تھا مجھے یادِ خدا کے ساتھ
لیکن نہیں تھا کچھ مشکل کے ٹلنے ہی

برسوں کی زندگی پل میں گزر گئی
اے سعدؔ کیا ہوا آنکھوں کو ملنے ہی

ساری باتیں یاد تھیں اُس کو
لیکن ہر اک بات سے پہلے
میرا نام بُھلایا اُس نے
کیسے آج جلایا اُس نے

کوئی نغمہ ہے کوئی گیت ہے

کوئی نغمہ ہے کوئی گیت ہے
کسی پیار کا کسی ربط کا
وہ جو لمحہ سُنائی دے مری رُوح میں
مری رُوح میں جو یقین ہے جو گمان ہے
یہ امان دے مری رُوح کو
یہ جہان دے مری آنکھ کو
یہ اُڑان دے مری ذات کو
یہ کمان دے مری بات کو

یہ جو غیب میں کوئی ساتھ ہے

یہ عظیم ہے یہ علیم ہے

کبھی جوڑ دے مرے جسم کو مری جان سے ۔۔۔ کسی شکل پر

کبھی ڈال دے وہ ہزار کوس کے فاصلے ۔۔۔ مری عقل پر

اسے جانچنے کا جتن کروں

میں عجیب ہُوں کہ وجُود ملتے ہی یک بیک

یونہی توڑ دیتا ہُوں رابطے۔ اُسی ذات سے

وہ جو لمحہ لمحہ سنائی دے ۔۔۔ کوئی نغمہ ہے کوئی گیت ہے

کسی پیار کا کسی ربط کا

چھوٹے چھوٹے واقعات .....

چھوٹے چھوٹے واقعات کیسے یاد رہتے ہیں

اُس کا میرے واسطے

کھولنا کواڑ کا

ایک لمحے کے لیے اُس کا میرا سامنا

کیسا ایک لمحہ تھا

جس کو کوئی آہ بھی منجمند نہ کر سکی

وہ ہزار لمحوں میں

جانے کیسے پھیل کر رُوح میں سما گیا

کیسا ایک لمحہ تھا
جس نے اپنے ساتھ ساتھ
اور کتنے واقعات
میری لوحِ ذہن پر تب سے ثبت کر دیے
چھوٹے چھوٹے واقعات کیسے یاد رہتے ہیں

شٹل کاک

"تم نے شٹل تو دیکھی ہو گی
کتنی اچھی لگتی ہے
کوئی ملکہ یا کوئی شہزادی جیسے
پہلی سروس پر جب باہر آتی ہے
کیسے رقصاں رہتی ہے
ایک پری کی صورت — اپنے پورے حسن کے ساتھ
اور دیکھنے والے سرحرکت میں رہتے ہیں — آہ مگر"
مغرب کی اس دوشیزہ نے

اپنی بات کو جاری رکھا

"جب اس نازک بگلی کا

کوئی اِک پَر گر جاتا ہے

اس کا توازن کھو جاتا ہے — پھر باقی کیا رہ جاتا ہے

اُس کی شکل بگڑ جاتی ہے — ناگنگ میں — اور اگلے روز

سویپر اُس کو لے جاتا ہے کُوڑے میں"

باغِ جناح میں ایک شام

اُڑتی چند بدلیاں ہلکی سی پھوار ہے

دل میں گُزری یادوں کی ایک جوئبار ہے

اِک سفید بنچ پر اجنبی سے لوگ ہیں

یہ خوشی کی ساعتیں زندگی کا روگ ہیں

آم کے درخت پر زرد زرد دُھوپ ہے

یہ بھی اک جُدائی کا جاگتا سا رُوپ ہے

پھر حسین جمگھٹا سامنے کے لان میں

اس کو بھی سجا لیا میں نے اِک گمان میں

جمگھٹے سے اس طرف ننھے بچّے کھیلتے
تتلیوں کو دیکھتے اور پھول توڑتے
رابطہ وہ خواب کا زندگی سے جوڑتے

دیکھتے ہی دیکھتے آئی شام پیاس میں
تھا جناح باغ بھی ماتمی لباس میں
سارے رنگ مر گئے بولنے کی آس میں

تنہائی

میری تنہائی میں اب کے
کوئی چاند نہیں ہے روشن
بکھری سی کچھ یادیں ہیں
کچھ شکلیں کچھ باتیں ہیں
پھر آنکھوں کے پس منظر میں
کچھ اَن دیکھی راتیں ہیں
سب قاصر ہیں جوڑنے سے
میرے سارے ٹوٹے رشتے
زندگی اور سچّائی کے

اب تو یہ بھی ڈر ہے مجُھ کو
شور نہ اندر کا بڑھ جائے
اور مَیں پھر گھبراہٹ میں
بند نہ کر دوں سب دروازے
ماضی کے اور مستقبل کے

عبداللہ شاہ کے لیے ایک نظم

اک ستمبر آیا تھا
اُنیس سو چراسی کا

کھڑکیوں سے کھیلتے
بادلوں کے سات رنگ
آ رہے تھے وارڈ میں
عین میرے سامنے

جھومتے تھے پیڑ بھی
تالیوں کی گُونج میں
پھر ہوا کے ساز پر
بادلوں کا رقص تھا
جیسے ایک چاند کی
رُخصتی کا وقت تھا
جا چکے تھے ڈاکٹر
گرم کافی کے لیے
خوشگوار لمحے تھے
تُند و تیز نرسیں
خُوش تھیں چھیڑ چھاڑ میں
اور پھر کبھی کبھی
ڈاکٹر کے نام پر
قہقہے بھی اُٹھتے تھے

اور اُن سے بے نیاز
ایک شوخ نرس بھی
گفتگو میں محو تھی
ایک ٹیلی فون پر
جانے کس کے ساتھ وہ
زندگی کے وعدے تھے
موت تک نبھانے کے

بے خبر تھے سب وہاں
موسموں کے پھیر سے
مر رہا تھا ایک شخص
جانے کتنی دیر سے

تھا خُدا بھی دیکھتا

پھر وہ کیسے دیکھتا
اُس نے میرے بھائی کو
ایک تحفہ دے دیا
پُرسکون موت کا

آسماں سے اس کی روح
ہنس رہی تھی نرس پر
زندگی کے وعدوں پر
موت تک نبھانے کے

اب ستمبر آنا ہے
بارشیں بھی ہوتی ہیں
رنگ کوئی لے گیا

سب کچھ سچّا کیوں لگتا ہے

اب تک مجھ کو یاد آتا ہے
کتنا سُندر تھا بچپن بھی
جب میں دادی امّاں جی سے
سُنتا تھا اک پری کہانی
جس میں جھیل سی آنکھوں والی
لمبی لمبی پلکوں والی
اک ننّھی سی چاند پری تھی
دادی امّاں جی کہتی تھیں

اُس کو دیکھ کے ہر اک راہی
بس پتّھر کا ہو جاتا تھا

صرف کہانی ہی تھی اگر یہ
مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے
سب کچھ سچّا کیوں لگتا ہے
گھر میں ڈر سا کیوں لگتا ہے
کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے
جیسے مَیں بھی بوجھل ہو کر
خود اک پتّھر ہو جاؤں گا
مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے
سب کچھ سچا کیوں لگتا ہے

کیسا لگتا ہے !

کیسا لگتا ہے
فٹ پاتھ پہ بیٹھے رہنا
آتے جاتے لوگوں کو
دیکھتے رہنا سوچتے رہنا
پھر آوازوں کی چُپ میں
گِنتے رہنا ڈوبتے سُورج
دُور اُفق کے دامن میں

ڈھونڈتے رہنا اپنا موسم
ہر موسم کی پت جھڑ میں
گھورتے رہنا چلتے منظر
ڈھلتے سایوں کے اندر
بکھری چُپ آوازوں میں
خوف کا عالم پیڑوں پر
اِس میں پھر تصویریں بُننا
دُور بچھڑنے والوں کی
جن کے دیس میں سارے سُورج
سارے موسم سارے منظر
اپنے آنگن ہوتے ہیں
وہ خوش قسمت ہوتے ہیں

بسنت

شام ہے بسنت کی
تک رہا ہے آسماں
جا بجا نئی اُمنگ
بادلوں کے سنگ سنگ
رقص کرتے ہیں پتنگ
جیسے ایک جھیل میں
تیرتے ہوں سات رنگ
کُچھ ہوا کو کاٹ کر

خُوب پھڑپھڑائے ہیں
کُچھ ہُوا کے زور سے
خود ہی ڈگمگائے ہیں
کچھ زمیں کی سمت بھی
کٹ کے لڑکھڑائے ہیں
لوگ ان کو دیکھ کر
کیسے مُسکرائے ہیں
آسمانِ نیلگوں
چُپ ہے کتنی دیر سے

کِس قدر ہے جمگھٹا
کون جانے کیا ہُوا
کِس نے ڈور کاٹ دی
کِس کا مانجھا کٹ گیا

مَیں کھڑا ہوں اک طرف
یہ تماشہ دیکھتا
ہے مجھے بھی سوچنا
مَیں کھڑا ہوں کس جگہ
کِس جگہ ہے کائنات
آسمانِ نیلگوں
چُپ ہے کتنی دیر سے
شام ہے بسنت کی
تک رہا ہے آسماں
میری ذات — کائنات

پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے

جس میں نہ کوئی ہنس سکتا ہے
جس میں نہ کوئی رو سکتا ہے
ایسے بے بس لمحے پر تو
وقت بھی ساکت ہو سکتا ہے
پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے
آنکھیں خونی ہو سکتی ہیں
سڑکیں سُونی ہو سکتی ہیں
سارا منظر کھو سکتا ہے
پھر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے

زِندہ بُت

تیز جلتی دُھوپ میں
راستے میں اک جگہ
میری آنکھ رُک گئی
ایک زندہ بُت بنی
وہ نہ جانے کون تھی
دیر تک کھڑی رہی
بس کے انتظار میں
اُس کے اپنے سائے میں
اُس کا ننّھا بچّہ تھا

وہ پسینہ پُونچھتی
اور بچّہ دیکھتی
مسکراتی جب کبھی
اِک چمک سی آنکھ میں
اُس کے پھیل جاتی تھی
مَیں رہا یہ دیکھتا
ایک ماں کی مامتا
اپنے سچّے پیار میں
پھر مجھے وہ یوں لگا
جیسے مَیں وہ بچّہ ہُوں
اور وہ میری مامتا
پھر مَیں آ کے اپنے گھر
ماں کو ڈھونڈنے لگا

چلتے چلتے ایک نظم

بن برسے اک بادل گزرا
اور پھر میری آنکھوں میں
ہر اک منظر ڈوب گیا

ردِّ عمل میں

جب بھی چاہو ہمیں سینے سے لگاؤ
جب بھی چاہو نظر انداز کرو تُم

جب بھی چاہو کوئی انجام دکھا دو
جب بھی چاہو کوئی آغاز کرو تُم

اب نہ پائیں گے کبھی تیرا تسلّط
اپنے در اب نہ کبھی باز کرو تُم

موت زدہ آدمی کا خوف

مجھے خبر ہے میں جاگتا ہوں
مگر یہ کیا ہے
حواس میرے کہاں گئے ہیں؟
نہیں ہیں بس میں
حواس میرے
اگرچہ سب کچھ ہے پاس میرے
یہ ہاتھ میرے — یہ پاؤں میرے
یہ میری آنکھیں — یہ اُکھڑی سانسیں مری نہیں ہیں
یہ خواب کب ہے
میں خود کو چُھو کر بھی دیکھتا ہوں

میں جاگتا ہوں
میں سوچتا ہوں
کبھی میں آنکھوں کو بند کرکے
دریچۂ دل بھی کھولتا ہوں
ہر ایک حرکت پہ ڈولتا ہوں
میں جاگتا ہوں

چلو میں آواز دے کے دیکھوں
مگر بدن میں سکت نہیں ہے
کہ ہونٹ اپنے ہلا سکوں میں
یہ جسم وجاں کی تمام قوت کہاں گئی ہے

میں اپنی طاقت کو مجتمع کرنا چاہتا ہوں
کہ میرے سکتے کا زور ٹوٹے
تو جانکنی کے عذاب سے میرا جسم چھوٹے
نہیں نہیں یہ نہیں ہے بس میں

یہ خواب ہوگا
مگر مَیں سب کچھ تو سُن رہا ہوں
یہ آنکھیں میری کہ دیکھتی ہیں
کہ سب کے سب گھر میں سو رہے ہیں
مَیں چاہتا ہُوں
کوئی تو اُٹھے
مجھے ہلائے، مجھے جگائے، مجھے اُٹھا کر پلائے پانی

مگر وہ کیسے یہ جان پائیں
کہ میرا ذہن اور وجود آپس میں منقطع ہیں
وہ کیسے جانیں گے کرب میرا
اُنہیں خبر کیا
یہ بے بسی کا عذاب کیسے میں سہہ رہا ہوں
اُتر رہا ہے جو دِل میں میرے مَیں خامشی سے وہ کہہ رہا ہوں
مَیں اپنی طاقت کو بے بسی کے خلاف لانا تو چاہتا ہوں
مگر یہ خواہش دماغ میں ہے
اور اس سے آگے تو کچھ نہیں ہے

یہ حال میرا — خدا خبر ہے
وہ میرا ماضی
کہاں کہاں جا کے جُڑ رہا ہے
زمانہ پھر موڑ مُڑ رہا ہے
سفینہ طوفاں میں گھر گیا ہے

کہاں گیا ہے وہ خواب میرا
کہاں گیا ہے شباب میرا
بس ایک پل کا حساب میرا
یہ سندھ میرا، چناب میرا
سبھی یہ وہم و گماں کی باتیں
حقیقتوں میں عیاں ہُوئی ہیں
حقیقتوں کی تمام باتیں گماں ہوئی ہیں

یہ آخری ساعتیں ہیں شاید
کہ میں نے جن کو
قبول کرنے میں دیر کی ہے

یہی تھا اندیشہ دل میں میرے
میں دیکھتا ہوں
دُعا سے آگے خطا کھڑی ہے
مرے لیے یہ سزا بڑی ہے
میں وقت مانگوں تو کس سے مانگوں
جو مانگ پاؤں تو کیسے مانگوں
میں شرمساری سے سوچتا ہوں
اور اپنی سوچوں کو نوچتا ہوں

یہ کیا ہُوا ہے
کہ رُکتی سانسوں میں ایک جھٹکا مجھے لگا ہے
جو جاگنے کو
بنا کے سپنا اُڑا گیا ہے
یہ ابتدا تھی
یہ انتہا تھی
جو اپنی تجدید کر رہی تھی
جو میرے سارے شعور و منطق کی
خود ہی تردید کر رہی تھی

میں ابتلا سے نکل گیا تو
نہ بے کسی تھی، نہ بے بسی تھی
مگر میں اب تک بھی سوچتا ہوں
میں سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں

جھیل میں سمندر

جھیل سی نیلی نیلی آنکھیں
سب کچھ نیلا کر دیتی ہیں

ساگر اور گگن کی صورت
میرے دل کو بھر دیتی ہیں

آنکھ سے آگے

خوبصورت سا کوئی منظر ہو
یا کہ لمحے کی کوئی صورت ہو
آنکھ پُتلی میں جنم لیتی ہے
اور پھر دفن وہیں ہوتی ہے

دل یہ کہتا ہے کہ اس سے آگے
دیکھ پاؤ گے اگر تم جاگے

شکستگیِ گمان

جب کبھی عکس مری حسرت کا
شیشۂ دل میں نظر آتا ہے
رُوپ بنتا ہے کسی کثرت کا
یک بیک ٹوٹ بھی جاتا ہے کبھی
اور پھر خواب کی صورت اکثر
کرچیاں بن کے بکھر جاتا ہے
اور آنکھوں میں مری چپکے سے
خوف باہر کا بھی در آتا ہے

عکسِ احساسِ زیاں

آج تک مجھ کو نظر آئی نہیں
اپنی کوئی بھی خامی
اور ہر شخص کھڑا
سامنے
آئینہ نما دیکھ رہا ہے مجھ کو
اور میں ہوں کہ پسِ عکسِ شعاع
ایک پتھر کی طرح ٹوٹ رہا ہوں خود میں

آخر کب تک ؟

آخر قطرۂ شبنم ہی تھا
برگِ گُل کی رنگت پر وہ
کب تک چھپتا کب تک سجتا

سبز ملائم پتوں پر وہ
چُھپکے چُھپکے دھیرے دھیرے
کب تک رُکتا کب تک چلتا

اِک کانٹے کی نوک پہ اٹکا
ساتھ صبا کے جھونکوں کے وہ
کب تک بنتا کب تک ڈھلتا

وہ سُورج کو کب تک تکتا
کب تک روتا کب تک چلتا
آخر قطرۂ شبنم ہی تھا

اُس نے خود کو چھوڑ دیا پھر
رنگ سے ناتا توڑ لیا پھر

محبّت تو محبّت ہے

ہماری اِس محبّت کو
غلط فہمی سمجھ لو تم
یا خوش فہمی سمجھ لُوں مَیں
نہیں کچھ فرق دونوں میں

محبّت تو محبّت ہے
تمہاری ہو یا میری ہو

مجھے تو ہر حوالے سے
بہت آرام ملتا ہے
کہ جیسے باغ میں دل کے
کوئی اک پھول کھلتا ہے

یکسانیت کے دوراہے پر

یہ ہونا بھی نہ ہونا ہے
کہ یہ اک وہم لگتا ہے
مگر اس کو تو پل پل ہم
مجسّم کر کے چھوتے ہیں
مگر برعکس اس کے جو
نہ ہونا ہے وہ ہونا ہے
پسِ آئینہ کی جیسے
حقیقت ہے عیاں ہرسو

یہ سب کچھ پاس ہے میرے

مرے دستِ تخیّل میں

جہاں منظر پریشاں ہیں

مکمل ایک میلہ ہے

مکمل ہُو کا عالم ہے

کہاں میں ہوں کہاں وہ ہے

یہی میں ہوں جہاں وہ ہے

آوارہ خیال میں پناہ

محبّت میں عمل تو ہے

مگر معکوس ہے شاید

جہاں آ کر میں نکلا ہوں

یہ دشتِ سوس ہے شاید

تجھ سا کوئی نہیں ہے

ٹھیک کہا ہے تم نے

کچھ پانے کو کچھ کھونا پڑتا ہے

تب انسان حیاتی کا یہ زینہ چڑھتا ہے

لیکن میں نے — کچھ نہیں پایا

'کچھ' پانے کی خاطر سب کچھ کھویا —

'کچھ' کا کوئی بدل نہیں ہے گویا